ایوب خاور کی نظم پر سیاسی اثرات

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی☆
Dr. Altaf Yousaf Zai
ڈاکٹر نذر عابد☆☆
Dr. Nazar Abid

Absrtact:

Every Poet is supposed to be a sensitive citizen of his society. Deferent political, social, ethical and economical aspects are reflected in his thoughts. These all aspects are reflected in his poetry as the poetry is the reflection of life itself. In this article the political influence on the different poems of famous poet Ayub Khawar has been analyzed critically while giving relevant examples from his poetic works.

ایک حساس شاعر کی نظر اپنے ملک کے سیاسی و سماجی حالات پر بھی گہری ہوتی ہے۔ کوئی بھی شاعر اپنے وطن، اپنی مٹی اور اور اپنے لوگوں اور ان کے حالات سے کٹ کر شاعری تخلیق نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے ماحول کا نمائندہ ہوتا ہے۔ ایوب خاور اپنے ماحول، اپنے وطن اور اپنے لوگوں کا ترجمان شاعر ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "گل موسمِ خزاں" پہلی بار ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا ہے اور اس میں ان کا ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کے عرصے کا کلام شامل ہے۔ ان بیس سالوں میں ہمارے ملک میں دیگر سیاسی اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ دو انتہائی غیر معمولی واقعات بھی رونما ہوئے ہیں۔ پہلا واقعہ ۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق کا مارشل لا تھا اور دوسرا ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو ملک کے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی تھی۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ نوے روز کے اندر اندر انتخابات کرانے کا اعلان کر کے ابتدا میں سیاسی اور عوامی ردِ عمل کو کم کرنے کی کوشش کی اور بعد میں مختلف سیاسی و فوجی حربوں سے اپنی آمریت کو طول دیتے گئے۔ کبھی وفاقی مجلسِ شوریٰ قائم کی، کبھی اسلام کے نام پر ریفرنڈم کرایا گیا اور کبھی غیر

☆ اسسٹنٹ پروفیسر ہزارہ یونی ورسٹی، مانسہرہ
☆☆ صدر شعبہ اردو ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

جماعتی انتخابات کے نتیجے میں ایک ایسی اسمبلی اور ایسا وزیر اعظم منتخب کروایا گیا جو مارشل لا کی چھتری کے سائے تلے جی۔ایچ۔ کیو کے احکامات کے تحت وقت گزارتا رہا اور بالآخر اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے گئے ان سیاسی بتوں کو بھی ضیاء الحق نے خود ہی توڑ دیا۔ اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور وزیر اعظم کو معزول کر دیا گیا۔

آمریت کے اس طویل اور سیاہ دور میں نہ صرف سیاسی عمل کو روکے رکھا گیا بلکہ آزادیٔ تحریر و تقریر پر بھی پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ اہل قلم اور صحافیوں کو کوڑے لگائے گئے۔ ٹیلی وژن پر اذان نشر کرنے اور خاتون اینکر پرسن کے لیے سر پر دوپٹہ ڈالنے کے علاوہ ملک میں کسی اور اسلامی قانون کا نفاذ نہ ہو سکا۔ البتہ ’’ خلیفۃ المسلمین‘‘ کا نام اختیار کر کے اسلام کے نام پر آمریت قائم رکھی گئی۔ ان تاریک گیارہ برسوں میں ملک کے دیگر طبقات کے ساتھ ساتھ شاعروں اور ادیبوں نے بنیادی انسانی حقوق، جمہوریت اور آزادیٔ اظہار کے حوالے سے بہت کچھ لکھا اور خوب لکھا۔ ملک کے بیشتر شعرا نے سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر کروڑوں عوام کے سیاسی حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والے آمر کی آمریت کے خلاف قلم اُٹھائے۔ اس کربناک دور نے ہر حساس اور ذی شعور پاکستانی کو ایک شدید کرب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ایوب خاور جو اس ملک کے کروڑوں عوام کی سیاسی آزادی پر یقین رکھتے ہیں اور نہایت حساس شاعر ہیں، وہ کرب و الم کی اس طویل سیاہ رات کی تاریکیوں سے بھلا کیسے سمجھوتہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے اس سیاہ دور کے آغاز میں نظم ’’ انتباہ‘‘ میں اس ملک کے باسیوں کو مزید تاریکیوں سے باخبر کرتے ہیں۔

تم اپنی آنکھیں بچا کے رکھو
ابھی بہت سے عذاب باقی ہیں
خواب باقی ہیں لفظ و معنی کی حد سے باہر گلاب موسم کی
برف باری نے ڈس لیے ہیں
تم اپنی آنکھیں بچا کے رکھو
کہ آنے والا ہر ایک لمحہ
قیامتوں کا سفیر ہو گا
تم اپنی آنکھیں بچا کے رکھو
یہ خواب ہی اپنی زندگی ہیں (۱)

اسی تاریک دور پر ان کی ایک اور نظم ''ابھی موسم نہیں آیا'' ہے۔ اس نظم میں علائم و رموز سے انھوں نے اس دور کا ایک نقشہ کھینچا ہے جسکی ہر سطح میں اس دور کا جبر اور اس جبر کے غلاموں کے کچھ کردار اپنی کریہہ شکلوں کے ساتھ دبکے بیٹھے ہیں۔ ایوب خاور ان شب پرستوں کو ''انبوہِ غلاماں'' کہہ کر ان کے کردار سے شدید نفرت کا اظہار بہت بلیغ انداز میں ان لفظوں میں کرتے ہیں:

یہاں اک قریۂ عبرت میں قصرِ بلند وپُر حشم ہے
جس کے فرشِ نیلمیں پر اک انبوہِ غلاماں صف بہ صف
خالی سروں کو اپنے سینے پر جھکائے ہاتھ باندھے اپنے
آقا سے وفاداری کا دم بھرتا ہے، حاجت مند سائل کی
طرح بے وزن لہجے میں سخن کرتا ہے، جیتا ہے نہ مرتا ہے (۲)

ایک آمر و جابر کے جبر کے سامنے حصولِ مفاد کے لیے سر جھکانے والوں کو ایوب خاور نے نظم کے اس حصے میں ایسا ننگا کیا ہے کہ تاریخ کی سیاہ گرد کی دبیز تہیں بھی ان کی برہنگی کو ڈھانپ نہیں سکیں گی۔ اس سیاہ دور میں ہوا اور دھوپ کے استعارے اور اسیر انِ شام و فرات کی تلمیح کے ساتھ اس دیس اور اس کے عوام کی حالت کا نقشہ اس نظم کے ایک اور ٹکڑے میں ملاحظہ ہو:

ذرا اس قریۂ عبرت کے قصرِ پُر حشم سے اُس طرف دیکھو
ہوا محبوس ہے برگ و ثمر سے خالی پیڑوں کی
برہنہ ٹہنیوں کے ساتھ گرہیں ڈال کر باندھی گئی ہے اور
زمستاں کی سنہری دھوپ ٹکڑے ٹکڑے کر کے شہر کی اونچی
چھتوں پر چیل کووں کے لیے ڈالی گئی ہے، آتشِ گل سے
چراغِ شام تک جو کچھ دلِ عشاق کو ورثے میں ملتا ہے
اسیر انِ فرات و شام کے مانند زنجیر و سلاسل میں پرو کر
صاحبِ قصر و حشم کے سامنے لایا گیا ہے، پہرہ داروں نے
دریچے، کھڑکیاں اور بھاری دروازے مقفل کر دیئے ہیں
اور موسم ان دریچوں، کھڑکیوں اور بھاری دروازوں سے
باہر ساکت وجامد کھڑا ہے، باریابی کی اجازت چاہتا ہے
ماتمی رنگوں میں ڈوبا درد کا موسم حضورِ شاہ سے اپنے تنِ نازک

پر برگِ گل سجانے کی حمایت چاہتا ہے، بیڑیاں پہنے
ہوئے لب بستہ و ساکن ہوا کے پاؤں میں خوشبو کی پائل
باندھنے اور پھر اسے آزاد کرنے کی سعادت چاہتا ہے (۳)

۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق کے مارشل لا کے منحوس اندھیروں نے اس ملک کو گھیر لیا تو گیارہ برس تک روشنی اس دیس سے ناراض رہی۔ بالآخر ایک فضائی حادثے میں ضیا الحق کی موت کے بعد ۱۹۸۸ء میں ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء کے ملک کے سیاسی منظر نامے کو ایوب خاور نے علامتی انداز میں اپنی نظم ''پردے کے پیچھے کون ہے'' میں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں مارشل لا کے گیارہ سالوں کے منظر نامے کیلیے جن علامات و استعارات سے شاعر نے ایک خاص فکری ماحول تخلیق کیا ہے وہ ان کی بصیرت افروز شاعرانہ قوت کی دلیل ہے۔ اس میں سطحی جذباتیت کا شور شرابہ ہے، نہ سیاسی نعرہ بازی ہے اور مخالفانہ سیاسی پروپیگنڈا ہے۔ نظم کا فکری ماحول، لفظیات، علامات اور تمثالوں نے نظم کو ایسی معنویت کا حامل بنا دیا ہے کہ فکر و فن ہر دو لحاظ سے بلند پایہ فن پارہ ہے۔ نظم میں ملک کے کروڑوں پر کٹے پرندے ہیں جن کے آشیانے تنکا تنکا ہو گئے ہیں۔ اقتدار کے نشے میں بدمست شیر ہیں جو ہرنیوں کو ٹانگوں میں دبوچے ہانپتے ہیں۔ بدمست ہاتھی دلدلی جھیلوں میں اپنی کالک دھونے کے لیے غوطے کھا رہے ہیں۔ لومڑوں کے غول ہیں، سرخ آنکھوں والے چیتے ہیں جو دفتروں کے دفتر گھیرے بیٹھے ہیں۔ بھیڑیے بوٹیاں نوچنے کے لیے شہر کی چورنگیوں میں بیٹھے ہیں۔ بندر کو ڈگڈگی پر نچایا جا رہا ہے۔ سرکس کے پرانے شعبدہ بازوں نے پردے کو گرا رکھا ہے۔ کسی کو خبر نہیں کہ پردے کے پیچھے کون ہے۔ شاعر نے بڑی جرات کے ساتھ نشۂ اقتدار میں بدمستوں کی بدمستیوں کو حیوانی خصلتوں کی مجسم شکلوں میں پیش کیا ہے۔ نظم کے اس حصے کو ملاحظہ کیجیے:

جنگلی شیر اب سڑکوں پہ چوراہوں پہ
دن بھر دندناتے پھرتے ہیں اور رات کی چادر میں لپٹی
خواب گاہوں میں مزے سے ہرنیوں کو اپنی ٹانگوں میں
دبوچے ہانپتے ہیں
اور ہاتھی دلدلی جھیلوں میں اپنے کردہ ناکردہ
گناہوں کی سیاہی دھوتے دھوتے بس گدھوں کی طرح
اپنی بے حیا کالک پر لوٹے جا رہے ہیں

لومڑوں کے غول انگوروں کی بیلوں کے تصور سے نکل کر
گول میزوں پر سجے کھانوں کی خوشبو چاٹتے ہیں
آگ برساتی ہوئی آنکھوں میں چیتے
اک غلامانہ محنت کے دیے روشن کیے، دفتر کے دفتر گھیر کر
بیٹھے ہوئے ہیں اور کتے، خاکی کتے ان کے پہرے پر
ہمیشہ کی طرح چوکس کھڑے ہیں
شہر کی چورنگیوں پر بھیڑیے اک دوسرے کی خصلتوں سے آشنا
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بیٹھے ہوئے ہیں، منتظر ہیں
کب کسی کی آنکھ جھپکے اور باقی مل کر اس کی بوٹی
بوٹی نوچ ڈالیں (۴)

یہ نظم قاری کی بصیرت پر حاوی ہونے والی نظم ہے۔ یہ گیارہ سالوں کے سرکس کے ایک ایک کردار کی مکروہ شکل کو آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ نظم میں گیارہ برس کا محض پیش منظر ہی بیان نہیں کیا گیا بلکہ پس منظر کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ اس نظم کا عنوان ''پردے کے پیچھے کون ہے'' نظم کا ایک مصرع ہے جو نظم میں تین بار دہرایا گیا ہے جو پردے کے پیچھے بیٹھ کر کٹھ پتلیوں کی ڈوریں کھینچنے والے اصل کرداروں کی طرف بار بار اشارہ ہے۔ اور پھر یہ مصرع تو صورتِ حال کی نزاکت کو اور بھی نمایاں کرتا ہے:

ان کو کیا خبر پردے کے پیچھے بھی تو اک پردہ ہے اس پردے کے پیچھے کون دیکھے گا

شاعر کو گیارہ سالوں کی تاریخ بندی سے بھی اتفاق نہیں ہے۔ اس ضمن میں نظم کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:

میرے مولا
یہ وہ منظر ہے جسے اب تک صداقت سے کتابوں میں نہیں لکھا گیا ہے
صرف میری آنکھوں کے برتن میں گیارہ سال کے
تاریک روز و شب کی دلدل اور پرندوں کے سنہری، سبز
گیتوں کو ملا کر پل بہ پل کھولا گیا اور پھر یہ کیچڑ
شہر کے در و دیوار کے ہر مسامِ جاں پر لیپا گیا (۵)

ان کی اس نظم کے بارے میں گل شیر بٹ لکھتے ہیں:

> ”ان کی ایک عجیب و غریب نظم جو سب سے پہلے غالباً ۷۹۔۱۹۷۸ء میں ”سیپ“ میں چھپی تھی ”گل موسم خزاں کے تیسرے ایڈیشن کے وقت اس نظم کو انہوں نے ترمیم اضافے کے ساتھ شائع کیا۔“(۶)

”کچی نیند کی دہشت“ ایک اور نظم ہے جو ان روح فرسا لمحات کی یاد دلاتی ہے جب ملک کے سابق وزیر اعظم کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور ان سے اہلِ خانہ کی آخری ملاقات کرائی گئی۔ یہ نظم ذوالفقار علی بھٹو سے ان کی بیٹی بے نظیر بھٹو سے آخری ملاقات کے حوالے سے ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اپنے بیٹوں کے مقابلے میں بے نظیر بھٹو میں مستقبل کے امکانات کی جھلک زیادہ نمایاں دیکھ رہے تھے۔ سو وہ اپنے خاندانی سیاست اور ملکی سیاست کے حوالے سے بے نظیر بھٹو سے کافی کچھ توقعات وابستہ کیے ہوئے تھے۔ ان کی یہی بیٹی بعد میں ملک کی وزیر اعظم منتخب ہوئیں، یہ نظم ایک شدید کرب کی علامت ہے جو تہہ در تہہ ہے۔ اس میں دکھ اور افسردگی کا اظہار ایک ایسے خاص شاعرانہ سلیقے سے کیا گیا ہے کہ نظم اپنی معنوی گہرائی میں بھٹو کی پھانسی کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی حالات کا آئینہ بھی ہے۔ نظم کا ابتدائی حصہ دیکھیے:

تو اب کوئی سمت ہی نہیں
سفر کا امکان کچی نیند کا خواب سمجھو غزال روحوں پہ
ہجر آثار کُہر کے آسمان پھیلے ہیں، خیمہ گاہِ حیات میں
اک دیا جو روشن تھا اپنی لو سے بچھڑ رہا ہے
جو صبح صبح روشن طلوع ہونا تھی
اس کی تقدیر کا ستارا اب اپنا لنگر اُٹھا رہا ہے (۷)

ذوالفقار علی بھٹو کو ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو پھانسی دے دی گئی۔ ایوب خاور کی نظم ”ابھی جنازہ اُٹھا نہیں ہے“ بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے ہے۔ بھٹو کا جنازہ اس نظم میں ایک حوالہ ہے ورنہ نظم اپنے بلیغ استعاروں اور علامتوں کے باعث اگر ایک طرف افسردہ ماحول میں مستقبل کے سیاسی امکانات پر نوحہ ہے تو ساتھ ہی ساتھ ہوسِ اقتدار کے لیے ایک آمر کے ظالمانہ، بہیمانہ اور بھونڈے طور طریقوں کو بھی بے لباس کر رہی ہے۔ چار اپریل ۱۹۷۹ء کا منظر شاعر نے ان لفظوں میں سمویا ہے:

ہوا دریچوں میں بند ہے اور خواب آنکھوں میں قید ہیں

اور آہٹیں راستوں میں زنجیر ہو گئی ہیں
محل سرا کے تمام دیوار و در منقش سکوت اوڑھے کھڑے ہیں(۸)

اور آئندہ پیش آنے والے حالات کو اپنے وجدان کی قوت سے محسوس کر کے شاعر نے ان کی تصویر کشی بھی ان الفاظ میں کی ہے:

ابھی جنازہ اُٹھا نہیں ہے
سروں پہ رات آ گئی ہے، رستوں کے پیچ و خم بھی
پہیلیوں میں بدل گئے ہیں
پلٹ کے آنے کی ساری امید ایک جادو کی قید میں ہے (۹)

ملکی سیاست میں یہ ایک بڑا المیہ تھا۔ منتخب حکومت کا تختہ اُلٹ کر نہ صرف ملک کے آئین کو معطل کیا گیا بلکہ ایک منتخب وزیر اعظم کو پھانسی پر لٹکا کر ملک میں ایک ایسا بحران پیدا کیا گیا جس کی تلافی کرنے میں قوموں کو بہت عرصہ لگ جاتا ہے۔ اس المیے کے دوران شاعر نے آنکھوں دیکھا حال بھی نظم کیا ہے۔ اس دوران وطن اور اہلِ وطن پر کیا گزری رہی ہے اور کیا ہونے والا ہے، نظم کا یہ حصہ ملاحظہ کریں:

اندھیرا اپنے عظیم لشکر سمیت محبوس عظمتوں کے خلاف ہر
سمت خیمہ ان ہے، فصیل ہی کی طرح سے اس کے
محافظوں کی نگاہ پتھر ہے، شہر کے سب کواڑ باہر سے بند
ہیں اور ہر ایک چہرے پر قُفل کھلنے کی آرزو ہے (۱۰)

اپنے اقتدار کو طول دے کر اقتدار کے بھوکے ذہن نے کیا سوچ رکھا ہے؟ بھوکی آنکھوں نے کیا کچھ دیکھنے کی امید لگا رکھی ہے اور اقتدار کو طول دینے کے لیے کون سا شرمناک طریقہ سوچ رکھا ہے؟ نظم کا آخری حصہ اس سے پردہ اُٹھاتا ہے:

سماعتوں کو منادی سننے کی جستجو ہے

سنو

ہر ایک خاص و عام سن لے کہ
کل علی الصبح سب سے پہلے جو شخص اس
شہرِ بے پنہہ میں قدم رکھے گا وہ شخص عالم
پناہ ہو گا، ہمارا وہ بادشاہ ہو گا

منادی والا منادی کرنے کے حکم کا منتظر ہے
لیکن ابھی جنازہ اُٹھا نہیں ہے (۱۱)

اس مذکورہ بالا دور سے متعلق ایوب خاور کی نظمیں نہ صرف ان کا شاعرانہ احتجاج ہے بلکہ ایک گہرا تخلیقی کرب ہے جو شعری تجربے میں ڈھل کر ان نظموں کی صورت پاتا ہے۔ بقول فہیم اعظمی:

"ادیب حساس ہوتا ہے۔ داخلی طور پر وہ اپنے احساسات اور جذبات کے کتھارسس یا اظہار پر مجبور ہوتا ہے۔ خارجی طور پر وہ اپنے معاشرے اور سماج سے جُڑا ہوتا ہے اور ان تجربات میں حصہ دار ہوتا ہے جو معاشرے کے دوسرے لوگوں کو بھی ہوتا ہے مگر جو ان کا اظہار کرنے میں ادبی اصناف مثلاً افسانے، شاعری، انشائیہ وغیرہ کا سہارا نہیں لے سکتے۔ ادیب جب بحرانی ادب تخلیق کرتا ہے تو اس کے اندر تاریخ، احتجاج، شکوہ، آہ، واہ، بدصورتی اور جمالیات سب کچھ سمیٹے ہوتا ہے۔"(۱۲)

ایوب خاور کی سیاسی نظمیں کسی کے حق یا مخالفت میں نعرے بازی اور پروپیگنڈا نہیں ہے بلکہ تاریخ کے جبر کا شاعرانہ ردِ عمل ہے۔ انھوں نے ملک کے تاریخی واقعات کو شاعرانہ محاسن کے ساتھ نظم کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ایضاً، ص۷۳

۲۔ ایضاً، ص ۸۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۸

۴۔ ایضاً، ص۱۴۳

۵۔ ایضاً، ص۱۴۵

۶۔ کہانی سانس لیتی ہے، ص۱۱۶

۷۔ ایضاً، ص۷۴

۸۔ ایضاً، ص۷۶

۹۔ ایضاً، ص۷۷

۱۰۔ ایضاً، ص۷۸

۱۱۔ ایضاً، ص۷۸

۱۲۔ فہیم اعظمی ”ادب اور بحران“(اداریہ)ماہنامہ صریر، کراچی، شمارہ۸، جلد۶، جنوری ۱۹۹۵ء، ص۵